ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1957

Program: BS Islamic Studies (Spec. Qur'an & Tafsir)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: فقہ القرآن (1) (1957) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (تخصص قرآن و تفسیر)

سمسٹر: خزاں 2026

ہمتانی مشق نمبر 2 (یونٹ: 6 تا 9)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

(برائے مطالعہ و حوالہ)

نوٹ: یہ رہنما صرف مطالعے اور حوالے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو پابند کیا جاتا ہے کہ متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کریں اور جوابات اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

سوال نمبر 1 (20 نمبر)

سوال نمبر 1۔ مالِ غنیمت اور مالِ فیٔ کے احکام واضح کریں۔ (20)

تعارف

اسلامی ریاست کے مالی نظام میں مالِ غنیمت اور مالِ فیٔ دو اہم اصطلاحات ہیں جن کے احکام قرآن مجید نے خود واضح فرمائے ہیں۔ جنگ کے میدان میں دشمن سے حاصل ہونے والا مال اور بغیر جنگ کے حاصل ہونے والا مال دونوں کے مصارف اور تقسیم کا نظام الگ الگ مقرر کیا گیا

تاکہ مال چند ہاتھوں میں گردش نہ کرے بلکہ معاشرے کے تمام طبقات تک پہنچے۔ اس سوال میں دونوں کی تعریف، ان میں فرق اور ان کے مفصل احکام بیان کیے جاتے ہیں۔

فقہ القرآن کے اس یونٹ کی بنیاد سورۃ الانفال کی آیتِ خمس اور سورۃ الحشر کی آیاتِ فئی ہیں۔ ان آیات کی تفسیر و فقہی تفصیلات میں تقسیم کا تناسب، مستحقین کی فہرست اور بعد کے ادوار میں ان احکام کی عملی صورتیں شامل ہیں۔ عرب کے جاہلی دستور کے مقابلے میں اسلام نے اس باب میں جو عدل و شفافیت قائم کی، اس کا جائزہ بھی اس مبحث کا حصہ ہے۔

مالِ غنیمت: تعریف اور احکام

غنیمت اس مال کو کہتے ہیں جو مسلمانوں کو کفار سے جنگ اور قتال کے ذریعے حاصل ہو، جس میں اسلحہ، گھوڑے، سامان اور قیدی وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں مالِ غنیمت کا بڑا حصہ سردار لے لیتا تھا اور فوجیوں کے درمیان اس کی تقسیم پر جھگڑے ہوتے تھے، غزوۂ بدر کے موقع پر اسی مسئلے پر اختلاف پیدا ہوا تو سورۃ الانفال نازل ہوئی جس نے اعلان کیا کہ غنیمت اللہ اور رسول کی ہے، یعنی اس کی تقسیم اللہ کے حکم کے مطابق ہو گی۔ اس اعلان نے جنگی مال کو ذاتی لوٹ مار کے بجائے ریاست کے منظم نظام کے تحت کر دیا۔

مالِ غنیمت کا بنیادی حکم سورۃ الانفال میں بیان ہوا کہ جو غنیمت تم حاصل کرو اس کا پانچواں حصہ یعنی خمس اللہ کے لیے، رسول کے لیے، رسول کے قرابت داروں، یتیموں، مساکین اور مسافروں کے لیے ہے، اور باقی چار حصے جنگ میں شریک مجاہدین کے درمیان تقسیم ہوں

گے۔ پیادہ اور سوار کے حصوں میں فرق رکھا گیا، کیونکہ سوار کی ذمہ داری اور خرچ زیادہ ہوتا ہے۔ تقسیم سے پہلے غنیمت میں خیانت یعنی گلول کو سخت گناہ قرار دیا گیا ہے اور احادیث میں اس پر شدید وعید آئی ہے۔ امام کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ خاص خدمات پر کسی کو اضافی انعام یعنی نفل دے، اور جنگ سے پہلے ملنے والے بعض مخصوص اموال کے احکام بھی فقہاء نے تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

خمس نکالنے کے بعد باقی ماندہ غنیمت کی تقسیم عملی طور پر امیرِ لشکر کی نگرانی میں ہوتی تھی اور دشمن کے علاقے ہی میں تقسیم کر دینا معمول تھا تاکہ مال محفوظ رہے اور مجاہدین کے حقوق ضائع نہ ہوں۔ مقتول دشمن کا ذاتی سامان یعنی سلب اسے قتل کرنے والے مجاہد کو دینے کی روایت بھی احادیث میں موجود ہے اور فقہاء نے اس کے شرائط بیان کیے ہیں۔ قیدیوں کے بارے میں قرآن نے احسان کے طور پر چھوڑ دینے یا فدیہ لے کر رہا کرنے کی دو صورتیں بیان فرمائی ہیں، اور رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں سے فدیہ لیا بھی اور بعض کو بلا فدیہ احسان کر کے چھوڑا بھی۔ خلافتِ راشدہ میں یہ نظام بیت المال کی تنظیم کے ساتھ مزید منظم ہو گیا اور دیوان میں فوجیوں کے نام و تنخواہیں درج ہونے لگیں، جس سے اسلامی ریاست کے مالیاتی ڈھانچے کی بنیاد مضبوط ہوئی۔

مالِ فیٔ: تعریف اور احکام

فیٔ اس مال کو کہتے ہیں جو مسلمانوں کو دشمن سے بغیر جنگ و قتال کے حاصل ہو، مثلاً دشمن کا صلح کر کے جزیہ ادا کرنا، یا کسی علاقے کا بغیر لڑے اسلامی ریاست کے حوالے ہو جانا، یا دشمن کا اپنا مال چھوڑ کر بھاگ جانا۔ لفظ فیٔ کے معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں، کیونکہ یہ مال کفار

سے لوٹ کر مسلمانوں کے حق میں آ جاتا ہے۔ بنو نضیر کے اموال سے اس باب کی سب سے بڑی مثال ملتی ہے جس پر سورۃ الحشر کی آیات نازل ہوئیں۔

فئی کے مصارف سورۃ الحشر میں وہی بیان ہوئے ہیں جو خمس کے ہیں: اللہ، رسول، قرابت دار، یتیم، مسکین اور مسافر، اور ساتھ یہ حکمت بیان ہوئی کہ یہ اس لیے ہے تاکہ مال صرف تمہارے مال داروں کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے۔ فئی اور غنیمت کا بڑا فرق یہ ہے کہ غنیمت کے چار حصے لڑنے والوں کو ملتے ہیں جبکہ فئی کا پورا مال مذکورہ مصالح و مصارف میں خرچ ہوتا ہے، کیونکہ اس میں کسی فرد کی جنگی محنت شامل نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے بنو نضیر کی فئی کو مہاجرین اور ضرورت مندوں میں تقسیم فرمایا، اور بعد میں یہی مال بیت المال اور ریاستی اخراجات کا اہم ذریعہ بنا۔

دونوں میں فرق اور فقہی مباحث

خلاصۂ فرق یہ ہے کہ حصول کا طریقہ دونوں کو جدا کرتا ہے: قتال سے حاصل شدہ مال غنیمت اور غیر قتالی طریقے سے حاصل شدہ مال فئی ہے۔ اسی بنیاد پر عراق و شام کی فتح شدہ زمینوں کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجتہاد فرمایا کہ ان زمینوں کو فوجیوں میں تقسیم کرنے کے بجائے ان کے مالکوں کے پاس رہنے دیا جائے اور ان پر خراج مقرر کیا جائے تاکہ آنے والی نسلوں کا حق بھی محفوظ رہے۔ یہ فیصلہ

صحابہ کے مشورے سے ہوا اور اسلامی مالیاتی فقہ کی تاریخ کا سنہرا اصول بن گیا کہ اموال کی تقسیم میں مستقبل کی مصلحت بھی پیشِ نظر رکھی جائے۔

اس باب کے جدید اطلاقات میں جنگی مفتوحات کے بجائے ریاستی محصولات، خراج، جزیہ، عشر اور دیگر سرکاری آمدنی کے تصورات زیرِ بحث آتے ہیں جو بیت المال کے نظام سے جڑے ہیں۔ فقہاء نے واضح کیا ہے کہ ان اموال میں حکمران امین ہے مالک نہیں، اور ان کا مصرف مسلمانوں کی عمومی مصلحت ہی ہے۔ خیانت، کرپشن اور عوامی مال کی خوردبرد کو شریعت نے سخت ترین جرم قرار دیا ہے، کیونکہ یہ اموال پوری امت کی امانت ہوتے ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ مالِ غنیمت قتال سے حاصل ہوتا ہے جس کا خمس مخصوص مصارف کے لیے اور باقی مجاہدین کے لیے ہوتا ہے، جبکہ مالِ فئی بغیر قتال کے حاصل ہوتا ہے اور مکمل طور پر قرآن کے بیان کردہ مصارف اور عمومی مصالح میں خرچ ہوتا ہے۔ دونوں احکام کا مقصد مال کی منصفانہ تقسیم، ضرورت مندوں کی کفالت اور معاشرے میں دولت کی گردش کو چند ہاتھوں تک محدود ہونے سے روکنا ہے۔ یہ نظام اسلامی معیشت کے عدل و احسان کے اصول کی عملی مثال ہے۔

سوال نمبر 2 (20 نمبر)

سوال نمبر 2۔ جہاد کا لغوی و اصطلاحی مفہوم واضح کریں نیز صلح کے احکام پر جامع نوٹ تحریر کریں۔ (20)

تعارف

جہاد اسلام کی ان اہم اصطلاحات میں سے ہے جن کے بارے میں غلط فہمیاں عام ہیں، اس لیے اس کا درست لغوی و شرعی مفہوم سمجھنا ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے۔ قرآن مجید نے جہاد کو اپنے مال اور جان کے ساتھ اللہ کی راہ میں کوشش کرنے سے تعبیر کیا ہے اور اس کے احکام و حدود بھی واضح فرمائے ہیں۔ اسی مبحث سے جڑا ہوا دوسرا موضوع صلح ہے، کیونکہ اسلام نے جنگ کو مقصود نہیں بنایا بلکہ امن کو اصل قرار دیا ہے اور دشمن اگر صلح کی طرف مائل ہو تو اسے قبول کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس سوال میں پہلے جہاد کا مفہوم و اقسام اور پھر صلح کے احکام بیان کیے جاتے ہیں۔

فقہ القرآن کے اس یونٹ میں سورۃ الانفال، سورۃ التوبہ، سورۃ الحجرات اور سورۃ النساء کی متعلقہ آیات کی روشنی میں جہاد و قتال کے فرق، قتال کی شرائط و آداب اور صلح کے معاہدات کے فقہی احکام کا مطالعہ کرایا گیا ہے۔ صلح حدیبیہ اس باب کی سب سے بڑی عملی مثال ہے جس سے صلح کے اکثر اصول اخذ کیے جاتے ہیں۔

جہاد کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

جہاد عربی لفظ جُہد سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی مشقت اٹھانا، پوری قوت صرف کرنا اور کسی مقصد کے لیے انتہائی کوشش کرنا ہے۔ اسی مادے سے اجتہاد بھی ہے جس کا مطلب علمی کوشش کی انتہا کرنا ہے۔ لغوی اعتبار سے جہاد صرف جنگ کا نام نہیں بلکہ ہر وہ جدوجہد ہے جس میں انسان اللہ کی رضا کے لیے اپنی پوری توانائی صرف کر دے، خواہ وہ نفس کے خلاف ہو، علم کے حصول میں ہو یا حق کے اظہار میں ہو۔ اسی لیے حدیث میں اپنے نفس کی خواہشات کے خلاف کوشش کو بھی جہاد قرار دیا گیا ہے۔

شرعی اصطلاح میں جہاد کی دو تعریفیں ملتی ہیں: عام تعریف یہ ہے کہ دین کی سربلندی اور اللہ کی رضا کے لیے مال، جان، زبان اور قلم سے ہر ممکن کوشش کرنا، اور خاص فقہی تعریف یہ ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ریاست کے نظم کے تحت دشمن سے قتال کرنا۔ فقہاء نے قتال کو جہاد کی ایک قسم قرار دیا ہے نہ کہ پورا جہاد۔ اس فرق کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ قرآن میں جہاد کا لفظ اکثر عام معنوں میں آیا ہے، جبکہ قتال کے لیے الگ لفظ استعمال ہوا ہے جس کی شرائط و آداب مستقل بیان ہوئے ہیں۔

جہاد کی اقسام اور قتال کے احکام و آداب

جہاد کی معروف اقسام میں جہاد بالنفس، جہاد بالمال، جہاد باللسان و القلم اور جہاد بالسیف یعنی قتال شامل ہیں۔ فقہاء کے نزدیک دفاعی قتال، یعنی جب دشمن مسلمانوں کے علاقے پر حملہ کر دے، تو اس علاقے کے لوگوں پر فرضِ عین ہو جاتا ہے، جبکہ عمومی صورت میں یہ فرضِ کفایہ

ہے جسے اسلامی ریاست کی منظم فوج انجام دیتی ہے۔ اس سے یہ اہم اصول واضح ہوتا ہے کہ قتال کوئی انفرادی یا گروہی عمل نہیں بلکہ ریاست کا اختیار اور ذمہ داری ہے، اور اس کا اعلان و انتظام حاکمِ وقت کے نظم سے ہوتا ہے۔

قتال کے آداب و حدود بھی شریعت نے واضح کیے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی ہدایات ہیں کہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، راہبوں اور غیر مقاتل لوگوں کو قتل نہ کیا جائے، درخت اور فصلیں بلاضرورت تباہ نہ کی جائیں، مثلاً یعنی لاشوں کی بے حرمتی نہ کی جائے، اور معاہدہ توڑ کر غدر نہ کیا جائے۔ غیر مسلم شہریوں یعنی اہلِ ذمہ اور امان یافتہ افراد کا تحفظ بھی اسی نظام کا حصہ ہے اور حدیث میں معاہد کے قتل کو سخت گناہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ آداب اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں قتال کا مقصد فتنہ و ظلم کا خاتمہ ہے، تباہ کاری نہیں۔

صلح کے احکام

صلح سے مراد فریقین کا باہمی رضامندی سے تنازع ختم کر کے معاہدہ کرنا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اسے معاہدہ یا عہد نہ بھی کہتے ہیں۔ قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ اگر دشمن صلح کی طرف جھکے تو تم بھی اس کی طرف جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسا رکھو۔ صلحِ حدیبیہ سن چھ ہجری میں اس کی عظیم مثال ہے جس میں بظاہر ناموافق نظر آنے والی شرائط کو بھی رسول اللہ ﷺ نے قبول فرمایا، اور قرآن نے اسے فتحِ مبین قرار دیا۔ اس واقعے سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ صلح کا فیصلہ ظاہری شان کے بجائے حقیقی مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔

فقہی اعتبار سے صلح کی شرائط میں فریقین کی اہلیت، معاہدے کی مدت کی تعیین اور شرائط کا شریعت کے بنیادی اصولوں سے متصادم نہ ہونا شامل ہے۔ مدت کے بارے میں فقہاء کے درمیان صلحِ حدیبیہ کی دس سالہ مدت کو بنیاد بنا کر مختلف آراء موجود ہیں، اور امام کو مصلحت کے مطابق مدت مقرر کرنے کا اختیار تسلیم کیا گیا ہے۔ معاہدے کے بعد اس کی پابندی واجب ہے اور غدر یعنی بدعہدی قرآن و حدیث میں سخت حرام ہے۔ اگر دوسرے فریق کی طرف سے نقضِ عہد کا اندیشہ ہو تو اسے برابر کی سطح پر علانیہ معاہدہ ختم کرنے کا اعلان کرنا ہوگا، دھوکے سے حملہ جائز نہیں۔ غیر مسلم اقوام سے تجارتی و سفارتی تعلقات بھی اسی صلح و معاہدات کے باب میں داخل ہیں۔

حکمت و نتیجہ

جہاد اور صلح کے احکام کو ایک ساتھ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اصل ہدف امن و عدل کا قیام ہے۔ قرآن نے اہلِ کتاب اور دیگر اقوام کے ان لوگوں سے حسنِ سلوک کی اجازت دی ہے جو مسلمانوں سے دینی لڑائی نہیں لڑتے اور انہیں گھروں سے نہیں نکالتے۔ قتال کی اجازت پہلی بار سورۃ الحج میں ان الفاظ کے ساتھ دی گئی کہ ان لوگوں کو اجازت دی جاتی ہے جن پر ظلم ہوا اور جن سے لڑائی کی جا رہی ہے۔ اس سے دفاعی اصول واضح ہوتا ہے اور جارحیت قرآن کی تعلیمات کے خلاف قرار پاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جہاد وسیع مفہوم کی حامل اصطلاح ہے جس میں نفس، مال، زبان اور قلم کی جدوجہد کے ساتھ ریاستی نظم کے تحت دفاعی قتال بھی شامل ہے، جبکہ صلح اسلام کی ترجیحی پالیسی ہے جس کے معاہدوں کی پابندی کو ایمان کا تقاضا قرار دیا گیا ہے۔ دونوں احکام کا حسین امتزاج ہی اسلامی خارجہ پالیسی کی بنیاد ہے، جس میں دعوت کا استعمال عدل کے قیام تک محدود اور امن کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا گیا ہے۔

سوال نمبر 3 (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ وکیل کی شرعی حیثیت اور شرائط قلمبند کریں۔ (20)

تعارف

وکالت انسانی معاشرت و معاملات کی ناگزیر ضرورت ہے۔ ہر شخص نہ ہر کام خود کر سکتا ہے اور نہ ہر جگہ خود حاضر ہو سکتا ہے، اس لیے شریعت نے نیابت یعنی کسی دوسرے کو اپنا نمائندہ مقرر کرنے کا نظام دیا ہے جسے وکالت اور نمائندے کو وکیل کہتے ہیں۔ عدالتی وکالت اس کا سب سے مشہور شعبہ ہے جہاں فریقین اپنے مقدمات کی پیروی کے لیے وکیل مقرر کرتے ہیں۔ اس سوال میں وکیل کی شرعی حیثیت، وکالت کے ارکان و شرائط اور وکیل کی ذمہ داریوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

فقہ القرآن کے اس یونٹ میں وکالت فی الخصومت یعنی مقدمے کی پیروی کی وکالت مرکزی موضوع ہے، کیونکہ عدالت اور قضا کے باب کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے۔ قرآن مجید کی آیات، احادیث اور فقہاء کے مباحث سے وکالت کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے، البتہ اس کے حدود و قیود بھی واضح کی گئی ہیں جن کی پابندی وکیل اور موکل دونوں پر لازم ہے۔

وکالت اور وکیل کا مفہوم و شرعی حیثیت

وکالت کے لغوی معنی کسی کام کو دوسرے کے سپرد کرنا اور اس پر بھروسا کرنا ہے۔ فقہی اصطلاح میں وکالت اس عقد کو کہتے ہیں جس کے ذریعے ایک شخص دوسرے کو اپنے کسی ایسے تصرف میں اپنا قائم مقام بناتا ہے جو شرعاً نیابت قبول کرتا ہو۔ سپرد کرنے والے کو موکل اور نمائندے کو وکیل کہتے ہیں، اور جس کام کے لیے تقرری ہو اسے موکل بہ کہتے ہیں۔ خرید و فروخت، نکاح و طلاق کے بعض امور، قرض کی وصولی اور مقدمے کی پیروی وغیرہ میں وکالت عام طور پر رائج ہے۔

وکالت کی مشروعیت قرآن و سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ قرآن مجید میں اصحابِ کہف کے واقعے میں ان کا اپنے ایک ساتھی کو شہر سے کھانا خریدنے کے لیے بھیجنا وکالت کی اصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ و صدقات کی وصولی اور قربانی و خریداری جیسے امور میں صحابہ کو اپنا وکیل بنایا، اور قرض کی ادائیگی کے لیے بھی نمائندے مقرر فرمائے۔ مقدمے کی پیروی کے لیے وکیل مقرر کرنا بھی اسی اصل پر قائم

ہے، کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ کے دور میں فریقین عدالت میں حاضر ہو کر یا نمائندے کے ذریعے اپنا مؤقف پیش کرتے تھے۔ اس لیے فقہاء کے نزدیک وکیل مقرر کرنا جائز اور بعض حالات میں ضرورت ہے۔

وکالت کے ارکان و شرائط

وکالت کی صحت کے لیے چند شرائط بنیادی ہیں۔ موکل کے لیے شرط ہے کہ وہ اس تصرف کا خود اہل ہو، یعنی عاقل و بالغ ہو اور جس کام کی وکالت دے رہا ہے اس کا اختیار رکھتا ہو؛ جو کام وہ خود نہیں کر سکتا اس کی وکالت بھی نہیں دے سکتا۔ وکیل کے لیے شرط ہے کہ وہ عاقل ہو اور جس کام کی ذمہ داری لے رہا ہے اس کی سمجھ اور اہلیت رکھتا ہو۔ عدالتی وکیل کے لیے مقدمے کے مسائل، شہادت کے اصول اور عدالت کے آداب سے واقفیت عملی شرط کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ ناواقف وکیل موکل کے حق کو ضائع کر سکتا ہے۔

موکل بہ یعنی کام کے لیے شرط ہے کہ وہ جائز اور مباح ہو، نیابت قبول کرنے والا ہو اور معلوم و متعین ہو۔ گناہ اور ظلم کے کام میں وکالت جائز نہیں؛ کوئی شخص کسی کو ناحق قتل، چوری، جھوٹی گواہی یا رشوت کے لین دین کا وکیل نہیں بنا سکتا، اور عدالتی وکیل کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ وہ جس مقدمے کی پیروی کرے اسے حتی الامکان حق پر مبنی سمجھتا ہو۔ وکالت کا ایجاب و قبول بھی ضروری ہے، خواہ زبانی ہو یا تحریری وکالت نامے کی صورت میں ہو۔ وکالت عام بھی ہو سکتی ہے اور کسی خاص مقدمے یا کام کے لیے خاص بھی۔

وکیل کے حقوق و فرائض و ذمہ داری

وکیل شرعاً امین ہوتا ہے۔ موکل کا مال، دستاویزات اور راز اس کے پاس امانت ہیں، اس میں خیانت کرنا سخت گناہ ہے۔ وکیل پر لازم ہے کہ وہ موکل کی مصلحت کا پورا لحاظ رکھے، مقدمے کی تیاری دیانت و محنت سے کرے، عدالت میں سچی اور درست گفتگو کرے اور جھوٹے دلائل، جعلی دستاویزات اور جھوٹی گواہی سے ہر صورت اجتناب کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں بشر ہوں، تم میرے پاس مقدمات لاتے ہو، ممکن ہے کوئی اپنی دلیل میں زیادہ چرب زبان ہو اور میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں، تو جس کے لیے میں اس کے بھائی کے حق کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر دوں وہ اسے نہ لے، کیونکہ وہ آگ کا ٹکڑا ہے۔ یہ وعید وکیل اور خود دونوں کے لیے تنبیہ ہے۔

وکیل کو اجرت یعنی فیس لینے کا حق حاصل ہے اور اس کا تعین معاہدے میں ابتدا میں کر لینا چاہیے تاکہ بعد میں تنازع نہ ہو۔ وکیل اپنے اختیار سے تجاوز کرے تو اس کا تصرف موکل پر نافذ نہیں ہوتا، اور اپنی غفلت سے موکل کا نقصان کرے تو فقہاء کے اصولوں کے مطابق ضمان کی بحث پیدا ہوتی ہے۔ وکیل موکل کو کسی بھی مرحلے پر درست مشورہ دینے کا پابند ہے، حتیٰ کہ اگر حق مخالف فریق کی طرف ہو تو موکل کو صلح کی ترغیب دینا بھی اس کے پیشہ ورانہ اخلاق کا حصہ ہے۔ وکالت ختم بھی ہو جاتی ہے: موکل کے عزل کرنے، وکیل کے استعفے، کسی ایک کی وفات یا کام کے مکمل و ناممکن ہو جانے سے وکالت کا عقد ختم ہو جاتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ وکالت قرآن وسنت سے ثابت شدہ جائز اور ضروری نظامِ نیابت ہے اور وکیل موکل کا شرعی قائم مقام وامین ہوتا ہے۔اس کی صحت کے لیے موکل و وکیل کی اہلیت، کام کا جائز و معلوم ہونا اور ایجاب و قبول شرط ہے۔عدالتی وکیل کی ذمہ داریاں عام وکیل سے بڑھ کر ہیں، کیونکہ اس کے ہاتھ میں کسی کا حق اور عدالت کا اعتماد ہوتا ہے۔اگر وکالت دیانت، سچائی اور اہلیت کے ساتھ انجام پائے تو یہ نظامِ عدل کی مضبوطی کا ذریعہ بنتی ہے، اور اگر اسے جھوٹ و فریب کا ذریعہ بنایا جائے تو یہ وکیل و موکل دونوں کے لیے دنیا و آخرت کی تباہی کا سبب بنتی ہے۔

سوال نمبر 4 (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔عورتوں کی گواہی سے متعلق ایک تفصیلی نوٹ تحریر کریں۔(20)

تعارف

شہادت اسلامی نظامِ قضا کی بنیاد ہے، کیونکہ اکثر مقدمات کا فیصلہ گواہوں کی گواہی پر ہی ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے شہادت کے نظام کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور اسی ضمن میں عورتوں کی گواہی کے احکام بھی واضح فرمائے ہیں۔اس موضوع پر جدید دور میں بہت سی غلط فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں، اس لیے فقہی اصولوں کی روشنی میں اس کا متوازن مطالعہ ضروری ہے۔اس سوال میں عورتوں کی گواہی کے قرآنی اصول، مختلف نوعیت کے مقدمات میں اس کا حکم اور اس کی حکمت بیان کی جاتی ہے۔

فقہ القرآن کے اس یونٹ میں سورۃ البقرہ کی آیتِ دین، سورۃ النساء، سورۃ المائدہ اور سورۃ الطلاق کی آیاتِ شہادت کا مطالعہ بنیاد بنایا گیا ہے۔

فقہاء نے شہادت کو مقدمات کی نوعیت کے اعتبار سے تین بڑے شعبوں میں تقسیم کر کے عورتوں کی گواہی کا حکم الگ الگ بیان کیا ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

شہادت کا عمومی نظام اور عورتوں کی گواہی کی اصل

شہادت کے لغوی معنی حاضر ہونا اور مشاہدہ کرنا ہے، اور اصطلاح میں کسی حق کے ثبوت کے لیے عدالت میں سچی خبر دینا گواہی کہلاتا ہے۔ قرآن نے شہادت کو چھپانے سے منع فرمایا اور عدل کے ساتھ گواہی دینے کو ایمان کا تقاضا قرار دیا، خواہ گواہی اپنے یا اپنے قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ مالی معاملات میں قرآن کا عمومی نظام یہ ہے کہ دو مرد گواہ بنائے جائیں، اور اگر دو مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، تاکہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ یہ حکم سورۃ البقرہ کی سب سے طویل آیت میں قرض کے معاہدے کے ضمن میں بیان ہوا ہے۔

اس آیت کی روشنی میں جمہور فقہاء کے نزدیک مالی معاملات میں عورت کی گواہی مرد کے ساتھ مل کر قبول ہوتی ہے اور دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے قائم مقام شمار ہوتی ہے۔ اس حکم کی علت قرآن نے خود بیان کر دی ہے کہ یہ یاد دہانی اور بھول چوک کے امکان کی بنا پر ہے، جو اس دور کے معاشرتی حالات میں خواتین کے مالی معاملات میں عملی مشغولیت کی کمی سے متعلق تھا۔ اس کا مقصد عورت کی توہین ہرگز نہیں،

بلکہ حقوق کے ثبوت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط اور غلطی سے محفوظ بناتا ہے، اور یہی اصول مردوں کے لیے بھی مختلف صورتوں میں زیادہ گواہوں کی صورت میں موجود ہے۔

مختلف مقدمات میں حکم: حدود، مالی اور خاص امور

پہلا شعبہ حدود و قصاص کے مقدمات ہیں۔ جمہور فقہاء کے نزدیک زنا، چوری اور قذف جیسی حدود اور قصاص کے ثبوت میں صرف مردوں کی گواہی معتبر ہے اور عورتوں کی گواہی قبول نہیں ہوتی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حدود شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں اور ان سنگین سزاؤں کے ثبوت میں شریعت نے زیادہ سے زیادہ احتیاط برتی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور جمہور کا یہی موقف ہے، اگرچہ بعض فقہاء کی جزوی آرا اس سے مختلف بھی نقل ہوئی ہیں جن کا مطالعہ کتبِ فقہ میں ملتا ہے۔

دوسرا شعبہ مالی معاملات اور حقوق اللہ کے علاوہ وہ معاملات ہیں جو مال سے متعلق ہوں یا مال کا مقصد رکھتے ہوں، مثلاً خرید و فروخت، قرض، رہن، اجارہ، نکاح کی مالی شرائط اور وصیت وغیرہ۔ ان میں ایک مرد و دو عورتوں کی گواہی بالاتفاقِ جمہور قبول ہے، اور نکاح و طلاق جیسے معاملات میں بھی احناف کے نزدیک عورتوں کی گواہی مردوں کے ساتھ مل کر معتبر ہے۔ تیسرا شعبہ وہ امور ہیں جن پر عموماً مردوں کی اطلاع نہیں ہوتی، مثلاً ولادت، رضاعت، بچے کی جنس اور عورتوں کے خاص عیوب و حالات۔ ان امور میں احناف اور جمہور کے نزدیک اکیلی

عورت کی گواہی بھی قبول ہوتی ہے، کیونکہ ضرورت کا تقاضا یہی ہے اور خود رسول اللہ ﷺ کے عمل سے رضاعت کے معاملے میں ایک عورت کی گواہی پر عمل ہونا ثابت ہے۔

حکمت اور فقہی توازن

عورتوں کی گواہی کے احکام کی حکمت کو سمجھتے وقت شہادت کی طبیعت کو بھی نظر رکھنا چاہیے۔ شہادت محض عزت و وقار کا منصب نہیں بلکہ ایک ذمہ داری اور بوجھ ہے جس میں گواہ کو عدالت کی سختیاں، فریقین کی دشمنی اور جھوٹی گواہی کے اخروی عذاب کا سامنا ہوتا ہے۔ شریعت نے مختلف شعبوں میں گواہی کی شرائط اس شعبے کی نوعیت اور حصولِ ثبوت کی سہولت کے مطابق مختلف رکھی ہیں: کہیں چار مرد، کہیں دو مرد، کہیں مرد و عورت دونوں، اور کہیں صرف عورتیں ہی کافی ہیں۔ یہ تنوع اس بات کی دلیل ہے کہ نظامِ شہادت کا محور عدل اور حق کا تحفظ ہے نہ کہ کسی جنس کی برتری یا کم تری۔

معاصر فقہی بحث میں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ شہادت کے علاوہ دیگر ذرائعِ ثبوت، مثلاً تحریر، اعتراف، قرائن اور جدید سائنسی شواہد بھی عدالتی نظام میں استعمال ہوتے ہیں، اور عورت کے بیان کی حیثیت بحیثیت قاضی، محقق اور ماہرِ رائے بھی نظامِ عدل میں تسلیم شدہ ہے۔ علمائے امت نے عورت کو روایتِ حدیث میں سب سے بلند مقام دیا ہے؛ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایات پر پورا دین قائم ہے،

اور کوئی شخص ان کی علمی گواہی پر سوال نہیں اٹھاتا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ معاملہ اعتماد کا نہیں، مخصوص عدالتی شہادت کے شرعی ضابطوں کا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کی گواہی اسلامی قانونِ شہادت کا باقاعدہ اور معتبر حصہ ہے۔ مالی معاملات میں قرآن کے حکم کے مطابق ایک مرد و دو عورتوں کی گواہی قبول ہے، حدود و قصاص میں جمہور کے نزدیک مردوں کی گواہی شرط ہے، اور خواتین کے خاص امور میں اکیلی عورت کی گواہی بھی کافی و معتبر ہے۔ ان احکام کی بنیاد حق و عدل کے محفوظ ثبوت کی حکمت پر ہے۔ طالب علم کو ان احکام کو ان کے فقہی سیاق میں سمجھنا چاہیے تاکہ نہ غلط فہمی پیدا ہو اور نہ شریعت کے متوازن نظام کی تصویر مسخ ہو۔

سوال نمبر 5 (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ قاضی کی شرعی حیثیت واضح کریں نیز قاضی کی اقسام پر نوٹ تحریر کریں۔(20)

تعارف

قضا یعنی عدل و انصاف کے ساتھ مقدمات کا فیصلہ کرنا اسلامی ریاست کے اہم ترین فرائض میں سے ہے۔ جس معاشرے میں عدلیہ مضبوط و آزاد ہو وہاں امن قائم رہتا ہے اور مظلوم کو اس کا حق ملتا ہے۔ قاضی اس نظام کا مرکزی کردار ہے جس کے سپرد لوگوں کی جان، مال اور عزت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس سوال میں قاضی کی شرعی حیثیت، اس کی شرائط و ذمہ داریاں اور قیادتِ قضا کی مختلف اقسام بیان کی جاتی ہیں۔

فقہ القرآن کے اس یونٹ میں سورۃ النساء، سورۃ المائدہ اور سورۃ ص کی آیات مبارکہ ہیں جن میں عدل کے ساتھ فیصلہ کرنے، خواہشات کی پیروی نہ کرنے اور بے گناہی کا لحاظ رکھنے کی ہدایات آئی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ خود قاضی بھی تھے اور آپ نے صحابہ کو مختلف علاقوں میں قاضی مقرر کر کے بھیجا، جن میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا یمن بھیجا جانا سب سے مشہور مثال ہے۔

قاضی کا مفہوم اور شرعی حیثیت

قضا کے لغوی معنی فیصلہ کرنا اور کسی کام کو پورا کرنا ہے۔ اصطلاح میں قضا سے مراد شریعت کے احکام کے مطابق لوگوں کے درمیان تنازعات کا فیصلہ کرنا اور حقوق کو ان کے مستحقین تک پہنچانا ہے۔ قاضی وہ شخص ہے جسے ریاست کی طرف سے یہ منصب و اختیار حاصل ہو۔ قاضی کی حیثیت شرعاً بہت بلند بھی ہے اور انتہائی نازک بھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قاضی تین طرح کے ہوتے ہیں: ایک جنت میں اور دو

جہنم میں؛ جنت والا وہ ہے جس نے حق کو پہچانا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا، اور جہنم والے وہ ہیں جنہوں نے جان بوجھ کر ظلم کیا یا علم کے بغیر فیصلے کیے۔ اس حدیث سے قاضی کے منصب کی عظمت و خطرہ دونوں واضح ہو جاتے ہیں۔

شرعی حیثیت کے اعتبار سے قاضی اللہ کے احکام کا نفاذ کرنے والا اور ریاست کے حاکم کا نائب ہوتا ہے۔ اس کا فیصلہ ظاہری طور پر فریقین پر نافذ ہوتا ہے اور دنیا میں اس پر عمل لازم آتا ہے۔ قرآن نے حکم دیا ہے کہ جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو، اور ایمان والوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور تنازع کی صورت میں معاملہ اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ۔ قاضی اسی قرآنی نظام کا عملی مظہر ہے۔ فقہاء کے نزدیک قضا کا منصب قبول کرنا ضرورت کے وقت فرضِ کفایہ کی ادائیگی بھی ہے، کیونکہ اس کے بغیر معاشرہ فساد کا شکار ہو جاتا ہے۔

قاضی کی شرائط و اوصاف

قاضی کے منصب کے لیے فقہاء نے سخت شرائط مقرر کی ہیں۔ بنیادی شرائط میں مسلمان، بالغ، عاقل، آزاد اور عادل ہونا شامل ہے۔ علمی اعتبار سے قاضی کا مجتہد یا کم از کم فقہ و اصولِ قضا کا گہرا عالم ہونا جمہور کی رائے میں شرط یا افضل درجے کی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ جاہل قاضی احادیث کی وعید کا مصداق بنتا ہے۔ عدالت یعنی تقویٰ و دیانت بھی ناگزیر ہے، فاسق شخص کو یہ منصب نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح سماعت و

بصارت وغیرہ کا درست ہونا بھی عملی شرائط میں شامل ہے تاکہ وہ گواہوں کو سن سکے، ان کو پہچان سکے اور مقدمے کی کارروائی کو بخوبی سمجھ سکے۔

اخلاقی اوصاف میں قاضی کے لیے نرم خوئی کے ساتھ وقار، صبر و تحمل، غصے پر قابو، رشوت و سفارش سے مکمل اجتناب اور فریقین کے ساتھ مساوی سلوک شامل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قاضی غصے کی حالت میں دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ کرے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قاضی شریح کے نام مشہور خط اس منصب کا جامع دستور ہے جس میں قرآن و سنت سے فیصلہ، عدمِ واقفیت کی صورت میں اجتہاد، عدالت میں فریقین کی مساوات اور صلح کی ترغیب جیسے اصول درج ہیں۔ یہ شرائط و آداب بتاتے ہیں کہ قاضی کا منصب صرف علمی نہیں، کردار کا امتحان بھی ہے۔

قاضی کی اقسام

قاضی کی اقسام کو کئی اعتبار سے بیان کیا جاتا ہے۔ اختیار و دائرہ کار کے اعتبار سے ایک قسم قاضی القضاۃ یعنی چیف جسٹس ہے جو پورے ملک کی عدلیہ کا سربراہ ہوتا ہے اور دیگر قاضیوں کی تقرری و نگرانی اس کے سپرد ہوتی ہے؛ یہ منصب عباسی دور میں باقاعدہ قائم ہوا۔ دوسری قسم عام قاضی ہے جسے کسی شہر یا ضلع کے تمام مقدمات سننے کا اختیار ہوتا ہے۔ تیسری قسم خاص قاضی یا محدود الاختیار قاضی ہے جس کی تقرری کسی

مخصوص نوعیت کے مقدمات، کسی خاص معاملے یا کسی خاص مدت کے لیے ہوتی ہے، مثلاً صرف مالی مقدمات یا صرف نکاح و خاندانی امور کے قاضی۔

ایک اور تقسیم کے مطابق قاضی کی دو قسمیں تھیں قاضیِ جند یعنی فوجی عدالتوں کے قاضی اور قاضیِ عسکر کے نام سے بھی تاریخ میں ملتی ہیں جو فوجیوں کے مقدمات سنتے تھے۔ اسی طرح محکمۂ حسبہ کا محتسب اگرچہ قاضی نہیں ہوتا مگر امر بالمعروف اور بازار و اخلاقی امور کی نگرانی کی وجہ سے عدلیہ سے ملحق سمجھا جاتا ہے۔ مظالم کی عدالت یعنی دیوان المظالم بھی اقسامِ قضا میں شمار ہوتا ہے جہاں حکام و اہلکاروں کے خلاف شکایات سنی جاتی تھیں۔ جدید ریاستوں میں آئینی، اعلیٰ اور ماتحت عدالتوں کی درجہ بندی انہی کلاسیکی اقسام کی عصری صورت ہے جس میں اپیل و نظرِ ثانی کا نظام بھی شامل ہے، تاہم اس نظام کی روح وہی ہے کہ ہر قاضی اپنے دائرے میں مستقل اور قانون کا پابند ہو۔

قاضی کی ذمہ داریاں اور عدلیہ کی آزادی

قاضی کی ذمہ داری ہے کہ وہ مقدمے کو صبر سے سنے، فریقین کو برابر موقع دے، شہادت و دلائل کا جائزہ قانون کے مطابق لے اور فیصلہ قرآن و سنت و قانون کی روشنی میں بغیر کسی دباؤ کے سنائے۔ وہ حاکمِ وقت کے ناروا حکم کا پابند نہیں، کیونکہ خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہوتی۔ اسلامی تاریخ میں قاضیوں نے خلفاء و سلاطین کے خلاف بھی فیصلے دیے اور ان کی آزادی کو ریاست نے تسلیم کیا۔ قاضی

کو فیصلے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے، مشورہ اہلِ علم سے لینا مستحسن ہے، اور فریقین کی باہمی صلح کی کوشش کرنا بھی اس کے فرائضِ منصبی میں شامل ہے۔

قاضی کے لیے رشوت لینا بالاتفاق حرام اور اس پر سخت وعید آئی ہے، اور ہدیہ بھی اس حیثیت میں تہمت کا ذریعہ بن سکتا ہے اس لیے فقہاء نے اس میں سختی برتی ہے۔ قاضی تجارت و ذاتی کاروبار سے بھی دور رہے تاکہ اس کی غیر جانب داری مشکوک نہ ہو۔ آخرت کی جواب دہی کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی عہدے سے معزولی اور سزا کا نظام موجود ہے اگر قاضی بد دیانتی کرے۔ ان تمام ذمہ داریوں کا مقصد ایک ہی ہے کہ عدلیہ اس قدر معتبر ہو کہ کمزور ترین شخص بھی اپنے حق کے لیے اس کا دروازہ بے خوف کھٹکھٹا سکے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ قاضی اسلامی نظامِ عدل کا مرکزی منصب ہے جس کی شرعی حیثیت اللہ کے احکام کے نفاذ اور خلق کے حقوق کی حفاظت سے جڑی ہے۔ اس کے لیے علم، عدالت، تقویٰ اور تحمل جیسی شرائط لازم رکھی گئی ہیں۔ دائرۂ اختیار کے اعتبار سے قاضی القضاۃ، عام قاضی، خاص و محدود الاختیار قاضی اور فوجی و مظالم کی عدالتوں کے قاضی اس کی اہم اقسام ہیں۔ جس ریاست میں قاضی باعلم، بے خوف اور دیانت دار ہو وہاں عدل قائم رہتا ہے، اور عدل ہی ریاست کی بقا و ترقی کی اصل بنیاد ہے۔